طرح منہ کھولے بیٹھے تھے اور خلا میں دیکھ رہے تھے گویا موسم کا جائزہ لیتے ہوں۔ ان دنوں سارے دن ایک سے تھے۔ یا بارش ہوتی یا سورج نکل آتا۔ دھوپ بھورے رنگ کی جھلس دینے والی ہوتی' آسمان گرد آلود اور بدرنگ ہوتا جس پر ہر وقت فربہ مردار خور پرندوں کے غول اڑا کرتے اور فضا میں ایک عجیب قسم کی متلی آور بو پھیلی رہتی۔

وہ رات اسی مدہوشی میں گزری۔ ٹوٹی ہوئی چھت والی بارک میں دیوار سے ٹیک لگائے وہ بیٹھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بارش ہو رہی تھی۔ پانی کی زد میں جو لوگ آتے ان میں کھلبلی مچ جاتی اور اٹھ اٹھ کر ان لوگوں پر گرنے لگتے جو چھت کے نیچے سو رہے ہوتے' گالیوں اور گھونسوں کا طوفان اٹھتا اور آپ سے آپ ختم ہو جاتا۔ بارہ فٹ مربع کی کوٹھڑی میں سو سے زیادہ بدبودار' غلیظ انسان بند تھے۔ نعیم آہستہ آہستہ واپس آ رہا تھا۔ وہ سر شام سے آنکھیں کھولے دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اس پر غنودگی طاری ہو جاتی اور عجیب و غریب خواب دکھائی دیتے لیکن اس کی آنکھیں کبھی پورے طور پر بند نہ ہوتیں' بس غنودگی کی حالت میں آدھی مچ جاتیں۔ ان نیم وا آنکھوں میں اگر کوئی دیکھتا تو یقیناً خوفزدہ ہو جاتا کیونکہ وہاں پر ایک مردہ آدمی کی گدلی' بے حرکت آنکھیں دکھائی دیتیں' وہ جن میں سے ساری نظر غائب ہو چکی ہوتی ہے۔ اور خواب۔ ایسے عجیب و ہیبت خواب جو جاگنے پر یکسر ذہن سے نکل جاتے لیکن جن کے بعد ایک عجیب قسم کی تازگی اور توانائی سارے وجود میں محسوس ہوتی۔ جاگنے پر وہ ادھر ادھر دیکھتا اور کسی جگہ پر باتیں کرتے ہوئے لوگوں کے چند جملے اس کے کان میں پڑتے اور انسانی بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے [illegible] بعد' جو اسے مسلسل جلنے سے ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کمرے کی بو زندگی کی سب سے بڑی اذیت تھی جو وہ سہہ رہا تھا۔

صبح کاذب کے وقت وہ پوری طرح آنکھیں کھولے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب چند کسان آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ سننے لگا۔

''پھر ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی ایک ایک نیکی باری باری یاد کر کے دہرائی اور جب ایک اپنی بات ختم کر چکا تو دہانے کا پتھر ایک تہائی ہٹ گیا' اور دوسرے کی بات ختم ہونے پر پتھر دو تہائی ہٹ گیا' اور جب تیسرے نے اپنی نیکی سنائی تو غار کا منہ صاف کھل گیا اور وہ بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے۔''

''تین نہیں چار تھے۔''

''نہیں تین تھے۔''

''تجھ کو کیا پتا نہیں؟''

''اچھا جھگڑا مت کرو' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مطلب یہ کہ اپنی ایک ایک نیکی یاد کرو۔ سب۔''

''پہلے تم کرو۔''

''پہلے میں؟ اوررر اچھا سنو۔ اررر......''

سب ہنسنے لگے۔

"دانت مت نکالو۔ سنو۔ میں نے ایک دفعہ...... ایک دفعہ میں نے' میری گائے کو'سوکھر' ہو گیا تھا اور میں رات بھر اسے ٹکور کرتا رہا تھا۔"

وہ پھر ہنسنے لگے۔ "گائے کی نیکی سے کیا ہوتا ہے کوئی اور۔" کسی نے کہا۔

"کیوں نہیں ہوتا۔ بے زبان کے ساتھ نیکی کرنے سے...... نہیں ہوتا کچھ؟"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ اب تم بولو۔"

دوسرا بولا: "پار سال کے جاڑے کی بات ہے میں کھلیان پر بیٹھا تھا کہ ایک سوار آیا اور دروازے پر گر پڑا۔ اس نے بتایا کہ پولس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور اس کے پیٹ میں تین گولیاں ہیں۔ میں نے اس کو بھوسے کے ڈھیر میں چھپا دیا اور خون کے نشانوں پر بھی بھوسہ ڈال دیا اور گھوڑے کو بھگا دیا۔ پھر پولس ساری رات مجھے عذاب دیتی رہی پر میرے منہ سے اس کا بول نہ نکلا۔"

"یہ تو گائے سے بھی بدتر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ قاتل ہو۔" سب پھر ہنسے۔

"مجھے کیا پتا۔ میں نے تو نیکی کا کام کیا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے' اب تم بتاؤ۔"

تیسرے نے کوئی مختصر سی بات کی نقاہت کی وجہ سے جس کی آواز نعیم تک نہ پہنچ سکی۔

"بس۔ [illegible]"

"[illegible]"

"[illegible] چار......"

"بس بس۔ ٹھیک ہے۔"

ان کی سادہ' بے خطر آوازیں تھیں اور وقت کے اندیشوں کو انہوں نے فتح کر لیا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے نعیم کے ذہن میں ایک نظم کے مصرعے آنے لگے۔ وہ کچھ اس طرح تھے:

"ننگی شاخوں پر پرندے خوراک کی امید میں بیٹھے ہیں
اور ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے ہیں
نیچے ان کے خداؤں کے کارواں اپنی حمد وثنا گاتے ہوئے گزر رہے ہیں
پر پیڑ کہاں ہیں؟
میں دنیا کے چوراہوں میں بیٹھ کر بھیک مانگتا ہوں۔
اور دنیا میں پیغمبر آنا بند ہو چکے ہیں۔
اب لوگ صرف کہانیاں سنا کر چلے جاتے ہیں۔
پر لوگ کہاں ہیں؟"

اس نے دو تین بار نظم کو زیر لب دہرایا۔ اس نے شاعری بہت کم پڑھی تھی لیکن آج یہ نظم آپ سے آپ

تیار ہوگئی تھی۔ کیونکر؟ کیونکر؟؟ حیرت و استعجاب کے جذبات نے چند لمحوں تک اسے ششدر کردیا' پھر یکلخت اس کے اندر قوت اور توانائی کی ایک لہر پیدا ہوئی جس نے اس کو میکانکی طور پر اٹھا کر سیدھا کھڑا کردیا۔ سوتے اور جاگتے ہوئے جسموں کو پھلانگتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

ایک تازہ ہل چلے ہوئے کھیت کے کنارے کنارے بھاگتا ہوا وہ یکلخت رک گیا۔ سورج نکل رہا تھا۔ اولیں کوئوں کے ساتھ کبوتروں کی ایک ڈار کھیت میں آکر اتری اور خوراک کی تلاش میں ادھر اُدھر بکھر گئی۔ پھر چڑیوں کی ایک ڈار آئی اور کھیت کے دوسرے کنارے پر اتری۔ صبح سویرے کی آہستہ خرام تازہ ہوا اس کے چہرے سے ٹکراتی گزر رہی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ چند منٹوں میں مشرقی آسمان نے کئی رنگ بدلے۔ پھر زردی مائل گلابی رنگ کی کمزور دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پڑی' اور اڑتے ہوئے پرندوں پر' پھر اس کا رنگ سفید اور سنہری ہوتا گیا اور وہ درختوں کی شاخوں پر پڑی اور بارگوں کی چھتوں اور خیموں کی چوٹیوں پر' پھر تنوں پر اور بیدار ہوتے ہوئے انسانوں کے چہروں پر' پھر زمین کے چاک سینے پر اور پھیلے بکھرتے ہوئے کبوتروں پر اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین و آسمان کا وہ گنبد تھا اور اس میں محیط ہر شے اس عظیم الشان سنہری روشنی سے بھر گئی' حتیٰ کہ بالوں کو اڑانے والی آہستہ خرام ہوا بھی سنہری تھی اور اس میں تازہ سنہری مٹی اور سنہرے ہرے پتوں کی خوشبو تھی۔ وہ کئی لمحوں تک دم بخود کھڑا چاروں طرف پھیلتے ہوئے طلسم کو دیکھتا اور محسوس کرتا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلا اور کھیت کے درمیان پڑے [illegible] کی روح میں وہ عجیب و غریب [illegible] بڑھتی رہی اور گھٹتی رہی' بڑھتی رہی اور گھٹتی رہی۔ پھر پہلی دفعہ اس نے آنکھیں بند کیں۔

یکا یک وہ اٹھا اور دونوں بازو پھیلا کر پتھر سے لپٹ گیا اور اسے چومنے لگا' حتیٰ کہ وہ جگہ جگہ سے گیلا ہوگیا۔ پھر اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں میں سے مٹی اٹھائی اور چہرہ اس میں دبا لیا اور خوشی سے دیوانہ وار قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

UrduPhoto.com

جب وہ واپس بارک کے دروازے پر پہنچا تو لوگ اٹھ رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے یکا یک رات کی خوفناک بُو کا راز اس پر کھلا۔ ایک کونے میں' ایک خاموش معاہدے کے تحت' لوگوں نے ذرا سی جگہ خالی چھوڑ رکھی تھی جہاں پر رات بھر مائیں اپنے بچوں کی اور اپنی حاجت رفع کرتی رہی تھیں۔ پاس ہی گندگی میں لتھڑی ہوئی ایک انسانی لاش پڑی سڑ رہی تھی۔

''یہ'' ایک کسان نے لاش کی طرف اشارہ کرکے کہا' ''کوئی کہہ رہا تھا دو ہفتے سے یہاں پڑی ہے۔''

''یعنی ہم...... رات بھر'' خوف اور کراہت کے مارے اس کے ساتھی کی آواز بند ہوگئی۔

لوگ ڈرے ہوئے مویشیوں کی طرح بارک چھوڑنے لگے۔

(۴۷)

جب قافلہ روانہ ہوا تو وہ بے اختیار بولنے لگا:

"تم نے کبھی ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف دیکھا ہے؟ جب سے نسلِ انسانی کا آغاز ہوا ہے لوگ اسے حیرت و استعجاب سے دیکھتے آئے ہیں۔ آج ہزاروں برس کے بعد بھی وہ اسی طرح شاندار اور عظیم ہے۔ اور تمہیں کبھی ساحل سمندر پر جانے کا اتفاق ہوا ہے؟ تھو تھو تھو تم تو صرف تاریخ پڑھاتے رہے اور اس سے پہلے...... خیر بہرحال، سمندر اور آسمان اور طلوعِ سحر کا منظر اور تاج محل اور شیکسپیئر، ان سب میں، ساری چیزوں میں ایک حسن ہے جو لازوال ہے اور وہ تخلیق کا حسن ہے۔ خدا کی تخلیق اور انسان کی تخلیق۔ حسن اپنی اعلیٰ ترین شکل میں صرف تخلیق میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ لافانی ہوتا ہے اور وہ صرف بہترین تخلیق میں پایا جاتا ہے۔ جب وہ کسی ادنیٰ تخلیق میں نمودار ہوتا ہے تو محض اصل کی تصویر ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے اپنی ساری دلکشی کے ساتھ، اپنی ساری دلکشی کے باوجود، جیسے انسانی ہستی جو بالآخر مٹ جاتی ہے۔ مگر اعلیٰ ترین سطح پر خدا انسانی روح کی تخلیق کرتا ہے اور آسمانوں اور سمندروں اور پہاڑوں کی روح کی طرح وہ لافانی ہوتی ہے اور اس کی دلکشی بھی، اور پھر یہ حسن کی تخلیق کرتی ہے ایک اور حسن کی۔ خدا کی بنائی ہوئی تمام چیزوں میں صرف انسانی روح ہے جسے تخلیق کی قوت ودیعت ہوئی ہے اور اسی طرح کائنات کا حسن قائم رہتا ہے خدا سے آدمی کی طرف اور پھر خدا کی طرف۔ خدا اور انسان دونوں تخلیق کے عمل کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور یہ ایک عجیب شے ہے...... حسن! یہ اتنی ہی زبردست اور بے پایاں قوت ہے جتنے اس کے دونوں خالق اور یہ بہت بڑی قوت ہے، محبت، مذہب اور موت سے بھی بڑی، زندگی سے بھی بڑی۔ کیونکہ یہ چیزیں ادنیٰ تخلیق ہیں محض وہ قوتیں ہیں جو اعلیٰ تخلیق کی طرف مائل کرنے میں مددگار کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

"مثلاً زندگی! میں تم کو بتاتا ہوں۔ زندگی جو نام ہے ہر قسم کی تکلیف اور راحت میں عمر بسر کرنے کا، کس طرف کو سفر کرتی ہے؟ دانائی کی طرف۔ کیا کنفیوشس اور افلاطون کی دانائی کبھی ضائع ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ کبھی دوبارہ زندہ نہ ہوں گے، مگر جو کچھ انہوں نے دیکھا اور جانا اور محسوس کیا وہ آج ہزاروں سال کے بعد بھی ایک طاقتور اور جاندار قوت ہے اور جب تک زندگی باقی رہے گی یہ قوت انسانوں کے درمیان زندہ اور متحرک رہے گی۔ کیونکہ یہ زندگی ہے جو ہر ایک کو بسر کرنا ہے اور یہ ایک ہی طرف کو سفر کرتی ہے۔ دانائی حسین ہے کیونکہ تخلیق ہے اور تخلیق حسین ہے کیونکہ دانائی ہے۔ تم دونوں کو جدا نہیں کر سکتے۔

"اور محبت؟ کیا عہدِ قدیم کے انسانوں کی محبت کی داستانوں کو تم بھلا سکتے ہو؟ دنیا میں سب سے بڑی محبت پیغمبروں نے کی ہے، اور محبت ایک ایسی قوت تھی جس نے انہیں ایک اعلیٰ ترین تخلیق کی طرف ابھارا۔ لیکن اب پیغمبر آنا بند ہو چکے ہیں۔ اب محبت صرف فنکار کرتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے موسیقی ایجاد کی، جنہوں نے شعر لکھے،

جنہوں نے سنگتراشی کی وہ جنہوں نے زندہ رہتے ہوئے زندگی کو خیر باد کہا وہ جو فراغت اور جسمانی راحت کی زندگی ہوتی ہے جس کے لئے ہر کوئی کاوش کرتا ہے اسے چھوڑ کر وہ الگ ہو گئے اور تنہائی میں چپکے چپکے کام کرتے رہے ختم ہوتے رہے غیر فانی ہوتے رہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ سنو۔ یہ وہی محبت تھی جو پیغمبروں نے خدا سے پائی اور جب ہمارے پاس پہنچی تو اس کا رتبہ لگن کا ٹھہرا' اور لگن کی روشنی میں کچھ لوگوں نے تخلیق کی اور ہمیں زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کیا۔ ہم سب محبت نہیں کر سکتے' ظاہر ہے' لیکن پیغمبروں کے خاتمے سے ہم پر بدقسمتی وارد نہ ہوئی کیونکہ محبت کے چراغ سے چند اور چراغ جلے اور آنے والے عہد میں جلتے رہے اور اس طرح وہ شعلہ قائم رہا اور اس کی روشنی اور حرارت کی مدد سے انہوں نے زندہ رہنے کا ایک عظیم الشان قرینہ ایجاد کیا' اس کی لو میں انہوں نے زندگی کی کثیف اور غلیظ بے ترتیبی اور بے ڈھنگے پن میں سے ایک لطیف اور شاندار تنظیم برآمد کی جو ہمیں ورثے میں ملی اور اب ہماری جائداد ہے اور جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ تو دیکھا تم نے' اس ساری بات کی تہہ میں محض ایک قوت تھی' جہاں ساری قوتیں جا کر ملتی ہیں' تخلیق کی قوت' محبت کا محض [illegible] ہے۔ تم بیٹھے رہو۔ میں تھکا ہوا نہیں ہوں۔ رات بھر آرام کیا ہے۔

''اور مذہب؟ سچ ہے کہ تخلیق کی نہایت اعلیٰ شکل ہے' اور نہایت دلکش۔ یہ واحد [illegible] ہے جہاں خدا' انسان اور روح آپس میں یوں مدغم ہو گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تخلیق در تخلیق اس سرعت کے ساتھ [illegible] کی خلاقی کا کمال دیکھ کر ہوتی ہے۔ یہ وہ بلا خیز ذاتی تجربہ ہے جو ہمیں...... مثلاً کسی تباہ کن زلزلے سے زندہ بچ کر نکل آنے سے ہوتا ہے یا اس سے بھی کچھ بڑھ کر جیسے یہ' یہ اب' یہاں......'' وہ چاروں طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔ ''یہ اب' یہ اب...... ہاں مذہب' بلند ترین تخیل ہے۔ یہ بے مثال مظہر ہے' جہاں خیال فوراً ہی عمل کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے اور پھر وہ محض اپنے زور پر ایک پوری زندگی اور اس کی منزل کا تعین کرتا ہے' تمام نوع انسانی کو بنیادوں تک ہلا دیتا ہے' لاکھوں انسانوں کی روح میں حرکت اور گرمی پیدا کرتا ہے۔ آج بھی انسانوں کی سوسائٹی میں مذہب سب سے بڑی واحد قوت ہے...... تو اس کا اسرار کیا ہے؟ اس کا راز؟ بتاؤ۔ ہنہہ ہنہہ ہنہہ۔'' وہ چالاکی سے مسکرایا۔ ''ایمان۔ یہ ایمان کی تخلیق کرتا ہے اور سینہ در سینہ' نسل در نسل' عہد در عہد اسے منتقل کرتا جاتا ہے۔ ہم ایک مذہب کے حق میں اور دوسرے مذہب کے خلاف بہترین دلائل دے سکتے ہیں لیکن ہم ایمان سے یقین نہیں اٹھا سکتے جو کہ سارے مذاہب کی روح ہے۔ یہ مشترکہ جائداد ہے۔ یہ لاعلم اور بے بہرہ لوگوں کو زندہ رہنے کا اور مرنے کا غیر متزلزل ارادہ عطا کرتا ہے ایک آئیڈیل' ایک خواب' وہ شخص جو اپنے دروازے سے باہر کسی شے کا علم نہیں رکھتا اور جس کی ملکیت میں ایک صحن اور ایک چولہے کے علاوہ کچھ نہیں' ایمان کی ہمراہی میں دفعتاً تمام زندگی...... اور تمام موت...... کے معنی سمجھ جاتا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ مذہب ہی ایک ایسا علم ہے جس نے کسی حد تک زندگی اور موت کے اسرار کو سمجھا اور بیان کیا ہے؟ مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے آگے دلائل ختم ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد میں بہتر مدلل

قوتوں کے مالک انسان پیدا ہوتے ہیں اور مذہب سے بددل ہوتے رہے ہیں کیونکہ جہاں دلائل ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے ایمان شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ پوشیدہ رو ہے جو تمام مذاہب کی تہہ میں رواں ہے۔ ایمان' یہ تجریدی اور تقریباً غیر دلچسپ لفظ' جس میں انسانیت اور خدائیت کے وسیع ترین معنی پوشیدہ ہیں' پُر اسرار اور غیر مشروط طور پر بے علم لوگوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے اور انہیں اطمینان اور وقار کے ساتھ ہر آفت کا' جس میں موت بھی شامل ہے' سامنا کرنے کا اہل بنا دیتا ہے۔ پھر ہر چیز اس قدر آسان اور قدرتی دکھائی دیتی ہے۔ کوئی آج تک نہیں سمجھ سکا کہ کس طرح کمتر ذہانت رکھنے والے لوگ اس Phenomenon کو قبول کر کے ایک عظیم جرأت کی اہلیت اختیار کر لیتے ہیں' لیکن تم بتاؤ' تخلیق کے عمل آج تک کون سمجھ سکا ہے۔ سائنس دان؟ ہونہہ! جب انسانی دماغ ''کیسے؟'' کے بعد ''کیوں؟'' پر غور کرنے لگتا ہے تو سارا علم ختم ہو جاتا ہے۔

''تو دیکھا تم نے' کس طرح منظم مذہب' اپنی عظمت کے باوجود' ایمان کے مقابلے میں دوسرا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایمان' جو مذہب کی تخلیق ہے' اس کا سارا [illegible] ہیں لوگ جو اس حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے مذہب سے بددل ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ میں بھی ان میں شامل تھا لیکن کل رات' وہاں ان کے ساتھ...... وہ چند بے علم گنوار دہقان تھے...... ان کے ساتھ بیٹھے بیٹھے دفعتاً مجھے ان کی طاقت' ان کی دانائی اور ان کے وقار کا علم ہوا جبکہ موت ان کے سامنے کھڑی تھی' ان کے درمیان چل پھر رہی تھی۔ زندگی کے اس عظیم جری لمحے میں انہوں نے [illegible] یہ تمام [illegible] دانائی اور اس کا وقار تھا۔ یہ اس قدر سادہ اور آسان تھا۔

''تو تم نے دیکھا' تم ذہین آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔ ''تخلیق...... سب سے اوپر ہے۔ سب سے میں نے دیکھا ہے۔ آج۔'' وہ دوبارہ شرما کر ہنسا۔ ''آج میں نے ایک نظم' تم جانتے ہو میں شاعر نہیں ہوں' پھر بھی آج' لیکن اب میں اسے بھول گیا ہوں۔ خیر چھوڑو اسے یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ یہ اس قدر سادہ اور آسان ہونے کے باوجود اس قدر مشکل بھی ہو سکتا ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو اپنے تمام علم اور عقل کے باعث افلاطون یا کوئی پیغمبر ہو سکتا تھا' لیکن اس کے پاس خدا نہیں تھا...... چنانچہ وہ دنیا میں پیدا ہونے والی کمترین اجناس میں سے تھا۔''

بوڑھا پروفیسر ہنسا: ''چلو اچھا ہوا۔ شاعری نے تمہیں زبان تو دے دی۔''

''اوّل تو مرد بولے ہی ناں' اور بولے تو کفن پھاڑ ہے۔'' علی نے بھی ہنس کر لاہور کا سیکھا ہوا ایک مذاق کیا۔

ان دونوں کو نعیم کی اس پُر اسرار چپ کے ٹوٹنے سے نمایاں خوشی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے نعیم کی لمبی تقریر کے دوران بوڑھا پروفیسر علی کی طرف جھک کر اس کے کان میں کہہ چکا تھا' ''اب تمہارے بھائی کی حالت پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ شکر ہے۔''

چلتے چلتے شام ہو گئی مگر نعیم متواتر باتیں کرتا رہا۔ پروفیسر تھکاوٹ کے باعث اسی خستہ حالت کو پہنچ چکا تھا

کہ نعیم کی باتوں سے اسے قطعی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر بھی جب اس کے خیال میں نعیم زیادہ اوٹ پٹانگ کہنے لگتا تو وہ ہمیشہ گاڑی سے نیچے اترنے کی کوشش کرتا اور اسے بیٹھنے کے لئے کہتا۔ نعیم ایک بار بھی اُسے ملنے نہ دیا۔ اس پر پروفیسر نہایت خفیف ہوتا اور چور نگاہوں سے علی کو دیکھنے لگتا۔ اس کے خیال میں علی' جو کہ گاڑی کا مالک تھا' یہ سمجھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس کا بھائی بھوک اور تھکان کی وجہ سے اس غیر حالت کو پہنچا تھا اور واہی تباہی بک رہا تھا جب کہ پروفیسر اس کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ کئے بیٹھا تھا۔

آخر جب اندھیرا بڑھا تو پروفیسر نعیم کی آنکھ بچا کر نیچے کود پڑا اور پھر علی کی مدد سے اس کو اٹھا کر گاڑی میں پھینک دیا۔ پھر جلدی سے علی نے تھوڑی سے گیلی روٹی اس کے ہاتھ میں تھمائی جسے وہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اشتہا کے ساتھ کھانے لگا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ پہلی دفعہ عائشہ کی طرف متوجہ ہوا:

''تم نے روٹی کھائی ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔

''بولتی کیوں نہیں؟ تم بھی کچھ بولو۔'' اس نے بڈھے مسخروں کی طرح ہنستے ہوئے لڑکی کے پیٹ میں گدگدی کی۔ وہ شرما کر مسکرائی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ علی کو اسے دنوں میں پہلی بار مسکراتی اور سرخ ہوتی ہوئی اپنی بیوی بڑی پیاری لگی۔ وہ خوش ہو کر ہنسا:

''[illegible] سنا ہے جوانی میں لڑکیوں پر ظلم ڈھایا کرتا تھا۔''

عائشہ اور بھی سرخ ہو گئی۔

''ہمارے گھر تم کیوں نہیں آتے تھے؟'' تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

''تمہارے گھر؟ دراصل مجھے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ گھر میں تم نے مجھے یاد رکھا تھا؟''

''ہاں۔''

''سب نے؟...... یعنی گاؤں میں؟''

''ہاں۔ بہت۔ گھر میں ہم سب تم کو یاد کرتے تھے اور باہر کھیتوں میں تمہارا ذکر ہوتا تھا۔ وہ جو تمہارے دوست تھے بڑے شوق سے بات کرتے تھے دوسرے کہانیوں کی طرح تمہاری باتیں سنتے تھے۔ علی گاؤں نہیں جاتا تمہارا میں جاتی تھی۔ تمہارے پکے مکان کے باغ کو اجاڑ دیکھ کر جی بیٹھ جاتا تھا۔ اور جی بیٹھ جاتا تھا جب گاؤں والے تمہیں پوچھتے تھے ان کے خیال میں ہم تم سے ملتے جلتے تھے۔ تم کبھی گاؤں کیوں نہیں آتے تھے؟''

''جی تو چاہتا تھا۔'' وہ یکلخت ماند پڑ گیا اور روٹی کے گرے ہوئے ریزے چن چن کر منہ میں ڈالنے اور جبڑے چلانے لگا۔ پھر تیزی سے اس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ ''بہر حال۔ یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ تم کس طرح رہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اچھی طرح سے نہیں رہیں۔ تم ایسی خوبصورت لڑکی تھیں...... تھی تھی

پتا ہے تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لیے علی میلوں تک میری گھوڑی کے ساتھ بھاگتا رہا تھا اور تم نے اپنی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ بہرحال گھر میں تم نے مجھے یاد رکھا۔ شکریہ۔ میری تو لمبی جلاوطنی تھی۔ ہنہہ، وہ تو ہم سب کی تھی یہ کیا اہم ہے۔''

دیر تک اسی طرح لڑکی کے ساتھ باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ وہیں پر لیٹ کر سو گیا۔

منہ اندھیرے وہ جاگ گیا اور اٹھتے ہی بلا تمہید باتیں کرنے لگا، یوں جیسے کبھی سویا ہی نہ تھا۔ کچھ دیر تک وہ عائشہ سے باتیں کرتا اور اسے گدگداتا رہا۔ پھر کم عمر لونڈوں کی طرح چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا اور علی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''یہ امرتسر کے گرد و نواح کا علاقہ ہے۔ میں سن انیس میں یہاں آیا تھا۔ سن انیس۔ ہم سب تھے۔ عذرا بھی ہمراہ تھی۔ عذرا؟ اوہ...... تم وہاں پہنچ کر کیا کرو گے۔''

''امرتسر؟''

''[illegible]''

''نہیں۔''

''[illegible]''

''ہاں۔ جلاوطنی میں سب جگہیں ایک سی ہوتی ہیں۔ تم بھی تو ساتھ ہو، کچھ بتاؤ۔'' علی نے کہا۔

''ہاں، ظاہر ہے۔ مجھے سوچنے دو۔ مگر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ سنو، اب میں تمہیں کسی کارخانے میں نہیں جانے دوں گا۔ وہاں مردہ خراب ہو جاتا ہے آدمی کا۔ اب ہم گاؤں میں چل کر رہیں گے۔''

''کس گاؤں میں؟''

''تمہارے تو سوال ہی ختم نہیں ہوتے۔ کہاں؟ کیوں؟ بھائی کسی بھی گاؤں میں چلے جائیں گے۔ یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں گے اور وہ یہ ہے۔ اب ہم کھیتی باڑی کریں گے۔'' وہ رکا۔ ''اور اگر تم سوچ رہے ہو کہ اپنا کام بھول جاؤ گے تو پھر۔ کتنا ہی کام ہے۔ ہل، کدال، پھاوڑا، درانتی، ٹوکا، پھر کنویں کا سامان اور جانوروں کی نعل بندی، رسے اور زنجیریں، ناندیں اور مچانیں، پھر گاڑیاں اور ان کا سامان اور گھر باہر کی کھڑکیاں دروازے اور طاق طاقچے، اتنا بہت سا کام ہے جو تم کر سکتے ہو اپنے گھر میں، اپنے گاؤں میں، اپنا اور دوسروں کا، نہ منت نہ محتاجی، بولو......''

''ہوں۔ مگر زمین۔''

''ارے مگر اگر مگر۔ تم تو ضدی ہو چکے ہو، بس۔ سب بیکار ہے۔ زمین کے قصے کا بھی کچھ نہ کچھ کریں گے۔ مگر اس کے بعد؟ اول تو یہ کہ سیدھے گاؤں جائیں گے۔''

''دوم یہ کہ سیدھے گاؤں جائیں گے اور سوم یہ کہ سیدھے گاؤں.....'' علی نے چڑ کر کہا۔

نعیم بولتا رہا: ''کہ گاؤں کی زندگی صاف' سیدھی اور حقیقی ہوتی ہے۔ اس کے بعد گھر بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں تم نے کچھ سوچا ہے۔ خیر تم سے تو یہ امید بیکار ہے۔ سنو۔ اس سلسلے میں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ چند دن آرام اور بہتر غذا کے بعد ہم کام کرنے کے قابل ہو جائیں گے ہم سب۔ ٹھہرو۔'' وہ چلتے چلتے پروفیسر کی طرف جھکا۔ ''تمہارا کوئی گھر ہے؟''

''نہیں۔''

''بس ٹھیک ہے۔ ہم تین آدمی ہیں اور کام کرنے والے ہیں۔ ابھی تو ٹانگیں سوج کر بیکار ہو چکی ہیں۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ چند روز تک تو ہم گاڑی پر چھت ڈال کر ہی کام چلا سکتے ہیں بہرحال' پھر مکان کھڑا کرنا شروع کریں گے۔ تمہیں مکان بنانے کا تجربہ نہیں اس لئے ڈر رہے ہو۔ مجھے بھی نہیں' مگر اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ بس محنت درکار ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ ایندھن کی ضرورت نہیں۔ پتھر اور گارے سے لوہے کی طرح مضبوط دیواریں بنتی ہیں' اور چھت کے لئے کیکر کی لکڑی مفید ہے' یا نیم کی جس کو دیمک نہیں لگتی۔ یہاں پنجاب میں کیکر اور نیم کے جنگل کے جنگل ہیں۔ یہ سارا ایک ہی علاقہ ہے۔ یہ بٹوارے کا قصہ سب بیکار ہے' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عائشہ چولہے بنا لیتی ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''تمہیں کچھ پتا نہیں۔ پر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ضرور بنا لیتی ہوگی۔ ہمیں صرف تین کمروں کی ضرورت ہے۔ پہلے پہل تو ایک ہی دالان سے کام چل سکتا ہے۔ ایک طرف بھوسہ آ جائے گا جو سردی کا بھی بچاؤ کرے گا' دوسری دیوار کے ساتھ ہم سو سکتے ہیں۔ ہم بوڑھے آدمی ہیں' تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔ تم مزے سے سونا۔ اور باہر جانور ہوں گے جن کے گرد دیوار بھی بنانا ہوگی مگر یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ چکنی مٹی اور بھوسے سے ساری دنیا دیواریں بناتی ہے۔ کواڑ اور کھڑکیاں اور طاقچے' یہ تمہارا کام ہے۔ روشندان بھی بنا لیتے ہو؟''

''ہاں۔''

''شکر ہے۔ پروفیسر تو کچھ نہیں کر سکتا۔ صرف مٹی ڈھو سکتا ہے۔ اگر اسے پڑھنے پڑھانے کا شوق چڑھا تو کام ختم ہونے کے بعد جانے دیں گے اس سے پہلے نہیں۔ ابھی طے کر لیتے ہیں۔ اور تم اسے گاڑی پر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتے' تم کسی کو گاڑی پر بیٹھنے سے منع نہیں کر سکتے۔ سب بیکار ہے' اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کام شروع کرنے کے لئے ہمیں بس یہ چیزیں چاہئیں: دو بالٹیاں پانی کے لئے' دو لکڑی کے تختے' اور ایک کلہاڑی' بس اتنی تیز کہ کیکر کو کاٹ لے۔ زیادہ تیز ہو تو دھار ٹوٹ جاتی ہے۔ بس۔'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''بس۔ آن کی آن میں ہم تمہیں دیوار کھڑی کر دیں گے۔ گاؤں کے لوگ سیدھے سادے اور خدا ترس ہوتے ہیں۔ یہ بھی بھلا بتلانے کی بات ہے۔ عمر بھر تو ہم لوگ گاؤں میں رہے۔ تم دیکھ لینا ہر روز کوئی نہ کوئی' ایک یا دو یا کبھی کبھی چار گاؤں والے ہماری مدد کو

آ موجود ہوں گے' آتے رہیں گے۔ دیہات میں بڑی خدا ترسی اور اصلیت ہوتی ہے۔ دنوں میں مکان تیار ہو جائیگا۔ گائے نہلانے سے لے کر فصل کاٹنے تک وہ برابر ہماری مدد کریں گے اور ہم ان کی۔ انہیں رہنے کا سلیقہ آتا ہے یہ ساری بات ہے..... یہ بھادوں کی دھوپ نامراد کیسی سخت ہوتی ہے۔ وہ پرندے والا کیا قصہ ہے' علی؟"

علی ایک پرانی بات کے حوالے کے لئے پوچھے جانے پر خوش ہوا۔ "اس کا نام ارد..... سرسوتی ہوتا ہے یا کیا' بالا جوتی۔ وہ گیارہ مہینے دھوپ میں بیٹھتا ہے مگر بھادوں کی دھوپ سہہ نہیں سکتا اور سائے میں چلا جاتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا..... یہی قصہ تھا نا؟"

"میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔" پروفیسر نے کہا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بھادوں کی دھوپ بہرحال کڑی ہوتی ہے۔ کڑی؟ کڑی کیا؟" اس نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ "اوہ.....! بارشوں سے ایسے مکانوں کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ ہمیں مستقل کام کرنا ہوگا۔ چھپر' گھاس پھونس' بیائی' تم جانتے ہو ہمیں اپنے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں' ہمارے پاس فالتو کچھ ہوگا ہی نہیں مگر جانوروں کے لئے چھپر چاہیئے' برسات میں بھیگنے سے دودھ سوکھ جاتا ہے اور بڑی بڑی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ اور برسات کے موقع پر....."

وہ بے تکان بولتا گیا۔ چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتیں جو اصل زندگی میں اتنی اہم ہوتی ہیں اس نے اتنی تفصیل اور محنت [illegible]

جب سورج ڈھلنے لگا تو دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ پروفیسر اور علی غائب ہو چکے تھے۔ وہ اس کا عادی تھا۔ اچک کر گاڑی پر بیٹھ گیا اور بے دھیانی سے حملہ آوروں کی اس ٹولی کو دیکھنے لگا جو ٹول ٹول کر جوان عورتوں اور چند مردوں کو ہنکائے لئے جا رہی تھی۔ نعیم کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ صرف آنکھوں کی چمک تھی جو یکلخت ماند پڑ گئی تھی۔ پھر وہ لاپرواہی سے ان کے سروں کے اوپر اوپر دیکھنے لگا۔ بھورے رنگ کی گرد آلود فضا میں مخصوص' مکروہ مہکتی ہوئی بو اور گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں تھیں۔ کچھ دیر بعد قریب ہی چند فائروں کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ بو بدستور قائم رہی۔

"کھیتی باڑی شروع کرنے کے لئے بھی زیادہ چیزوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" جب پروفیسر اور علی گاڑی کی اوٹ سے نکل آئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

"تمہیں پڑے گی نہیں پڑے گی۔" علی جل کر بولا۔ "ان کے سامنے ٹانگیں پسار کر بیٹھ جاتے ہو۔ یاد رکھو کبھی نہ کبھی وہ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے۔"

"بیچ میں مت بولو۔" نعیم نے خفگی سے کہا۔ "کوئی پکڑ کر نہیں لے جائے گا۔ بس ایک ہل اور دو بیل۔ ہل تو تم بنا ہی لو گے۔ دودھ کے لئے جانور بعد میں آ جائیں گے اور پہلی بیائی کے لئے بیج ادھار لے لیں گے۔ پنجاب کی زمین بڑی لائق ہے جتنی محنت کرو اتنا پھل دیتی ہے۔ پنجاب کی زمین کا آخر کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاری

اور ساونی کے علاوہ میں تم کو بتاؤں۔" وہ رازدارانہ طور پر علی کی طرف جھکا "سبزیوں میں بڑی کمائی ہے۔ یہاں کے اچھی ذات کے کسان سبزیاں اگانے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ ارائیوں کا کام ہے جو کہ جاٹوں سے نیچی ذات ہے۔ مگر یہ سب بیکار ہے۔ سبزیوں میں کمائی ہی کمائی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارائیں سبزیاں اگا اگا کر جاٹوں کی ساری زمین خرید لیتے ہیں اور اونچی ذات والے کسان آپس میں لڑتے مرتے اور مقدمے بازی کرتے رہتے ہیں۔ ہم سبزیاں بوئیں گے۔ یہ سب بیکار ہے۔ اونچی ذات 'نیچی ذات' ہونہہ۔ آدمی کی ذات کا اور سبزیوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں......"

"سبزیاں؟ کیا سبزیاں؟" علی نے پوچھا۔

"یہی سبز مونگرے' کریلے' کدو' توری وغیرہ......"

"اوہ...... اچھا۔" اب اس نے باقاعدہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔

"سبزیاں......"

"ہاں سبزیاں۔ اب رہے بیل۔ اور رر بیلوں کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"بیل......" علی بالکل خالی الذہن تھا' مگر کوشش کر کے اس نے سوچا۔ "بیل بھی کہیں نہ کہیں سے......"

"مجھے پتا تھا تم نے کچھ نہیں سوچا۔ بیل ہم پہلی بیائی کے لئے ادھار بھی لے لیں [illegible] بات کرنے کا طور آنا چاہیے۔ [illegible] خوشی سے بیٹھے دس دن کے لئے دے دیں گے۔ مگر دوسرے کے جانور کو بڑی احتیاط سے برتنا پڑتا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے۔ گھر میں جب کوئی بیل مانگ کر لے جاتا تھا تو ہمارا باپ احمد دین کے لونڈے کو جاسوسی کرنے کے لئے بھیجا کرتا تھا اور وہ شیطان پہر پہر کی آ کر خبر دیتا تھا کہ آج انہوں نے یہ کھانے کو دیا ہے جانور کو اور اتنا دیا ہے اور اتنا کام لیا ہے۔ تم سے کوئی بات چھپی ہوئی تھوڑی ہے۔ "تمہارے پاس کچھ رقم ہے؟"

"کچھ ہے۔ عائشہ کے پاس۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ایک جوڑی خرید بھی سکتے ہیں۔ فصل کے فصل پیسے چکاتے رہیں گے۔ جب ان کو علم ہو گیا کہ ہم ایماندار اور محنتی آدمی ہیں تو وہ اعتبار کر لیں گے۔ آخر ہم ٹھگ تھوڑے ہی ہیں۔ سچے کسان ہیں اور کاہلی سے دور بھاگتے ہیں۔ لیکن سبزیوں کے علاوہ اناج بھی اشد ضروری ہے۔ تم اناج کی بیائی بھول تو نہیں گئے؟"

"نہیں۔"

"شکر ہے۔ گیہوں کی بیائی اگلے مہینے شروع ہو جائے گی۔ یہ بہرحال بارشوں پر منحصر ہے۔ اگر برسات دیر تک چلتی رہے تو بیائی پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فصل کے تیار ہونے اور اترنے میں بیائی کا بڑا اہم مقام ہے۔ کس وقت میں ہو اور کیسی ہو۔ گیلی زمین میں جب تک مٹی پیر سے چپکتی رہے' کچھ بھی نہیں بونا چاہیے۔ تمہیں اپنے باپ کی باتیں یاد ہیں؟ ضرور ہوں گی۔ مجھے اس کے دیئے ہوئے سارے سبق آج تک یاد ہیں؟ گیلی زمین میں

UrduPhoto.com

مینڈک بھی مر جاتے ہیں' بیج تو بڑی نازک شے ہے' وہ کہا کرتا تھا۔ اور جوار باجرہ بھی بڑا ضروری ہے۔ کسان اگر ترقی کرنا چاہتا ہے تو وہ بارہ مہینے گیہوں نہیں کھا سکتا۔ اور پھر جانور ہیں جن کی گزر اوقات مکئی پر ہوتی ہے۔ مکئی کے بیری گیدڑ بہت ہوتے ہیں۔ بچاؤ کے واسطے کیا کرو گے؟"

"کتے رکھ لیں گے۔"

"کتے رکھ لیں گے۔" نعیم نے غصے سے ہاتھ نچا کر نقل اتاری۔ "اور جو کتوں کو کھلانا پڑے گا وہ کدھر سے آئے گا۔ تم نے اتنے برس تک کیا کام سیکھا ہے جو گیدڑ پھانسنے کا ایک پنجرہ بھی نہیں بنا سکتے۔ ہیں؟ کتے رکھ لیں گے۔" اس نے دوبارہ نقل اتاری۔ "تاروں کا ایک پنجرہ بنا لینا' بس۔ گیدڑ تو تمہیں پتا ہے ہوتے ہی ہیں۔ اپنے ہاں بھی ہوتے تھے۔ سب جگہ ہوتے ہیں۔ یہ یہاں وہاں اور اِدھر اُدھر کا قصہ سب بیکار ہے۔ گیدڑ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اور ساونی کی فصلوں میں گنا بڑا بار آور ہوتا ہے۔ جاڑوں کی راتوں کو گڑ ضرور بنانا' سردی سے محفوظ رکھتا ہے اور طاقت بھی آتی ہے اور کڑاہ پر جا بیٹھو تو آتا جاتا ہر کوئی چکھتا ہے اور فیض بڑھتا ہے' گڑ بنانے کا طریقہ تمہیں یاد ہے؟"

"جھنڈی کے ڈنٹھل۔"

"ہاں ہاں جھنڈی کے ڈنٹھل میل کو کاٹ کر لسّے کی طرح سفید گڑ بناتے ہیں۔ مگر گنے کی حفاظت کرنا بڑا جان جوکھم کا کام [illegible] اور جنگلی سئور جو کھیت کے کھیت [illegible] ستیاناس کر دیتا ہے۔ میں نے ایک بار زخمی سئور مارا تھا آمنے سامنے ہو کر۔ بڑا [illegible] جانور تھا کوئی' پر بھی کیا نادانی کی عمر تھی......"

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ قافلہ اسی طرح تھکی تھکی مستقل چال سے رواں تھا۔ نعیم دیر تک گاڑی کے ڈنڈے پر جھک کر بیٹھا تیزی سے باتیں کرتا رہا' جیسے وقت کے مقابل بھاگ رہا ہو۔ روزمرہ زندگی کی ان گنت باتیں' چھوٹے چھوٹے پروگرام' کتنی ہی باتیں اس نے عجلت اور مستعدی سے علی کے ذہن نشین کرائیں۔ برسات کی ہوا میں گلے سڑے پتوں اور تازہ جلے ہوئے بارود کی بو کہیں سے اڑتی ہوئی آئی۔

پھر اچانک رک کر اس نے لمبا سانس لیا اور پروفیسر کی طرف مڑ کر دھیمے لہجے میں بولا: "سنو' میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ شاید پھر بھول جاؤں...... زندگی...... زندگی کا ست' زندگی کا نچوڑ...... قربانی کا جذبہ ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ میں نے جانا ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔"

پروفیسر تھکے ہوئے اداس انداز میں مسکرایا۔

"نہیں۔ تم ہنس نہیں سکتے۔ میں بڑ نہیں مار رہا۔ میں جانتا ہوں' دل پر اتنے مرحلے' اتنی محتاجی آتی ہے اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ پروفیسر نے دیکھا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے

کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اسے صرف اتنی آواز سنائی دی:

’’اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔‘‘

جب وہ دوبارہ بولا تو رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ وہ یکلخت علی کی طرف مڑ کر خفگی سے بولا: ’’اس کے بعد ہمیں ان باتوں کا علم ہوتا ہے۔ تمہیں کیا علم ہے؟‘‘

’’کیا علم ہے کیا علم ہے۔‘‘ علی نے چڑ کر کہا۔ ’’جاننے کے لئے ہی کیا۔ اوٹ پٹانگ بولے جاتے ہو۔ خاموش رہو۔ تھک جاؤ گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ جاننے کے لئے بہت کچھ نہیں ہے۔ دو ایک باتیں ہیں وہ بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے: اگر ہم ہر سطح پر ہر وقت میں ہر چیز کی قربانی دے سکتے ہیں تو زندہ ہیں ورنہ نہیں ہیں...... اور تم کسی کو گاڑی پر بیٹھنے سے نہیں روک سکتے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔‘‘

علی حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا:

’’اس سے قطع نظر...... سنو۔ ایک بات اور بتاتا ہوں۔ عذرا میری بیوی ایک عظیم عورت ہے۔ اس کے پاس کوئی اندیشہ کوئی الجھن کوئی ریاکاری نہیں۔ وہ جو کچھ چاہتی ہے بلا جھجک اس کے لئے تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ انسان کی ساری شرافت سارے کرب اور ساری قربانی کے ساتھ خاموشی اور رضامندی سے زندہ ہے۔ خدا انسان کو اپنی شبیہ [illegible] کرتا [illegible]

پھر وہ پروفیسر کی طرف مڑا: ’’اور خدا بھی ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

پھر انہوں نے اسے تھوڑی سی گیلی روٹی دی جسے کھا کر وہ سو گیا۔

وہ بہت گہری نیند سو کر اٹھا۔ اجالا پھیل رہا تھا۔ قافلہ مسلسل چلے جا رہا تھا۔ اٹھتے ہی اس نے خوش دلی سے عائشہ سے باتیں چھیڑ دیں:

’’وہاں پہنچ کر تم چند روز میں تندرست ہو جاؤ گی۔ خالص ہوا اور خالص غذا صحت کے لئے اس سے مفید اور کوئی چیز نہیں۔ تمہیں زیادہ کام کرنے کی ضرورت نہیں، سارا کام ہم کریں گے۔ تم صرف کھانا پکا دیا کرنا۔ گاؤں والے کہیں گے' یہ نیا خاندان کیسا اچھا اور شریف ہے' تین جوان اور مختی مرد (پروفیسر ہنسا) اور ایک جوان اور خوبصورت لڑکی۔ تم چولہے بنا لیتی ہو؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

پھر وہ چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ ’’تم رات بھر چلتے رہے ہو۔ علی جوان آدمی ہے چل سکتا ہے۔ تم اب آرام کرو۔‘‘ اس نے ایک بازو سے دھکیل کر پروفیسر کو گاڑی پر بٹھا دیا۔

’’تم گیدڑوں کی بات کر رہے تھے۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ اگر مکئی کے کھیت کے گرد اگرد تم منقل کی

(۴)

اختتامیہ

UrduPhoto.com

I am moved by the fancies that are curled
Around these images and cling:
The notion of some infinitely gentle
Infinitely suffering thing.

Wipe your hand across your mouth, and laugh;
The worlds revolve like ancient women
Gathering fuel in vacant lots.

T.S. ELIOT

(۴۸)

علی لاہور کے سٹیشن پر پڑا تھا۔ سارے پلیٹ فارم بے گھر لوگوں سے اٹے پڑے تھے جو اپنے پھٹے پرانے بستر بچھائے اندر اور باہر ہر جگہ لیٹے تھے، بیٹھے تھے، سو رہے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ جو ہمت والے تھے، پیٹ بھرنے کے لیے مزدوری کرتے، بھیک مانگتے یا چوری کرتے، باقی کبھی کبھار اٹھ کر ریلوے کے نل سے پانی پی لیتے اور سارا وقت پڑے رہتے۔ سب کے چہرے بہرحال بھوکے، غلیظ اور بے تاثر تھے۔ ایک منزل جو نظر میں تھی اس پر وہ پہنچ چکے تھے اس سے آگے انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ اب اس سارے اژدہام پر ہولناک تھکن اور بے اعتنائی طاری ہو چکی تھی۔

UrduPhoto.com

دن [illegible] ہندوستان سے [illegible] اور [illegible] اتنے ہی لوگ ہندوستان جانے کے لیے یہاں سے گاڑیوں پر سوار ہوتے، یا شمال کی طرف سے گاڑیوں میں بھر کر آتے اور واہگے کی سرحد کی طرف نکل جاتے۔ یہ سب آنے والے اور جانے والے ایک ہی قبیلے کے افراد تھے۔ اس انسانی آبادی پر وہ وقت آیا تھا جب چہروں اور عقیدوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔

علی صرف اس وقت اٹھتا جب ہندوستان سے کوئی گاڑی آتی۔ کمزور ٹانگوں پر چلتا ہوا وہ گاڑی کی ساری لمبائی طے کرتا، ہر ایک ڈبے میں گردن ڈال کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور دوسرے سرے پر پہنچ کر وہیں بیٹھ جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی خالی ہو جاتی اور بدبودار، بدحال ہجوم چیختا پکارتا ہوا پھٹ پڑتا اور لاوے کی طرح ہر طرف پھیل جاتا۔ ہر دفعہ ایسا ہوتا کہ گاڑی کے سامنے سے گزرتا ہوا علی ہجوم کے دھکے کھا کر گر پڑتا اور چند لمحوں میں ان گنت قدموں کے نیچے روندا جاتا۔ ہر دفعہ وہ چیختا چلاتا اور گالیاں دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی بیکار تلاش کو جاری رکھتا۔ دو روز سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا لیکن یہ سوچنے کی اس میں قوت نہ تھی کہ وہ اب تک کیونکر زندہ تھا اور چل پھر اور لڑ جھگڑ رہا تھا۔ جو عام انسانوں میں ہمہ وقت زندگی کی ہزاروں چھوٹی بڑی چیزوں پر متعجب ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے اس میں ختم ہو چکی تھی۔ اس کے پاس اس کا بھی کوئی واضح تصور موجود نہ تھا کہ وہ کس کی تلاش میں تھا اور کس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ بھی غالباً زندگی کے ارتقاء کی اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش محض تھی۔

دوسرے دن وہ آہنی جنگلے سے ٹیک لگائے اونگھتا تھا کہ گرجتی ہوئی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔ وہ چونک کر اٹھا، مگر اس گاڑی میں سے کوئی نہ اترا کیونکہ وہ شمال کی طرف سے بھری ہوئی آئی تھی اور ہندوستان جا رہی

تھی۔ وہ پھر بنگلے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے اور چند ایک کھلی کھڑکیوں میں سے بچوں کے ایسے زرد اور خوفزدہ چہرے جھانک رہے تھے۔ گاڑی معمول سے زیادہ عرصے تک رکی رہی' پھر اس کا انجن الگ ہو کر چھک چھک کرتا ہوا تازہ دم ہونے کے لئے چلا گیا۔ چاروں طرف کشیدگی کا عارضی سناٹا پھیل گیا اور غیر معمولی طور پر بڑھتا گیا۔

پھر باہر ایک شور اٹھا اور واویلا کرتے ہوئے لوگوں کا چھوٹا سا ہجوم سٹیشن میں داخل ہوا۔ سامنے آتے ہی ان بظاہر غیر مسلح لوگوں میں سے ایک نے جیب سے پستول نکال کر ہوا میں دو فیر کئے۔ دوسرے نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر باہر دیکھتے ہوئے ایک زرد رو بچے کا نشانہ لیا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار...... پھر پلیٹ فارم پر سے تمام مردہ اور نیم مردہ لوگ حیرت انگیز جوش اور پھرتی کے ساتھ اٹھ کر گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے ٹوٹنے کی آواز اکا دکا ہوتے ہوئے فیروں کی خشک' پٹاخے دار آوازوں سے رل مل گئی۔ ان میں شامل مرنے والوں اور بھاگنے والوں کی چیخوں کی آواز اور حملہ آوروں کی ہاہاکار تھی۔ بہت سے لوگ کود کر گاڑی سے نکل بھاگے اور ہر طرف سے گھر گئے' بہت اندر ہی مر رہے۔ فضا میں تازہ انسانی خون کی بو پھیل گئی۔ علی کاہلی سے اس سارے منظر کو دیکھتا رہا' پھر اکتا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر بنگلے پر ٹیک دیا۔ "ان کے ساتھ والے فوجی کہاں گئے۔" اس نے سوچا۔

پھر اس نے آنکھیں کھول کر دائیں طرف دیکھا۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی جو بہت قریب سے آئی تھی۔ واویلا کرتی ہوئی وہ ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی عورت تھی جو اسی طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اچانک رک گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے... ظالم۔ ظالم۔ میرے خاوند کو میرے بچے کو مار دیا۔ مجھے بھی مار دو' مجھے کیوں چھوڑ دیا' کیوں چھوڑ دیا' کیوں۔"

عورت کی آنکھیں احمقوں کی طرح کوری تھیں اور اس کے چہرے پر بھی خوف کے علاوہ' شدید حماقت برس رہی تھی۔ کسی حماقت زدہ چہرے کو اپنے سے مخاطب دیکھ کر بعض دفعہ جو بلا وجہ غصہ آ جاتا ہے اس سے علی جھنجھلا گیا۔ پھر دفعتاً ایک قطعی بے وجہ اور غیر ضروری جذبے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس عورت کو مار گرانے' اس کا خون بہانے کی طاقتور' پاگل خواہش نے اسے پلک جھپکنے میں اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

عورت بولتے بولتے رک گئی۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور وقت ضائع کئے بغیر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چھاتی پر سے اپنا ململ کا کرتہ دامن تک پھاڑ ڈالا۔ نیچے اس کی جلد صاف گندمی رنگ کی تھی اور دو بھاری بھاری پھولے ہوئے تھن مشکوں کی طرح پیٹ پر لٹک رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مشکل کے ساتھ انہیں اوپر اٹھایا اور آگے بڑھی۔

"مجھے مت مارو' خدا کے لئے۔ یہ دیکھو' یہ" اس نے تھن علی کی ٹھوڑی کے نیچے ٹھوس دیئے۔ "رحم کرو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔"

علی نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر پھر سے امن ہو گیا۔ صرف راستہ گزرنے والے لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع اندر باہر بکھری ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد علی کی رہی سہی بھوک بھی غائب ہو گئی۔

تیسرے دن کسی نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ یہ بانو تھی۔

"میں نے تمہیں انبالے کے سٹیشن پر دیکھا تھا" وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "تمہارے ساتھ ایک لنگڑا سا بڈھا تھا۔ ہماری گاڑی وہاں سے گزری تھی۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم کو گاڑی کہاں سے ملی؟ اور تمہاری بیوی ......" بانو نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھا۔

علی نے بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں چاروں طرف نظر دوڑائی' پھر نقاہت کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں ہر روز یہاں آتی ہوں' اپنے لڑکے کی تلاش میں ...... میں نے پہلے تو تمہیں نہیں دیکھا۔"

"تمہارا بیٹا ...... بھی ہے؟" علی نے آنکھیں کھول کر پہلی دفعہ بات کی۔

"ہاں' کمال ۔ میرا بچہ۔"

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوئیں کی موجودگی کی وجہ سے ایک عجیب خوف ناک تلخی آور بُو پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی علی کو دیکھتی رہی۔ اس وقت اچانک اس کے دل میں' اپاہجوں کی طرح تانگے کے ساتھ آنکھیں موند کر بیٹھے ہوئے اس شخص کے لئے وہ جذبہ پیدا ہوا جس کی صرف عورتیں اہل ہوتی ہیں۔

"چلو ...... میرے ساتھ۔" اس نے علی کا کندھا ہلایا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارا اسباب کہاں ہے؟"

"نہیں ہے۔"

وہ خاموشی سے چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ پھر بانو نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم چل نہیں سکتے۔" بانو نے کہا۔ "میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔"

مشکل سے علی کو تانگے کی پچھلی سیٹ پر سوار کرا کے وہ اس کے برابر بیٹھ گئی اور بتانے لگی۔

"یہاں مجھے کپڑے کے کارخانے میں کام مل گیا ہے۔ وہیں نور دین بھی مل گیا۔ نور دین کو تم جانتے ہو؟ فوج جو وہاں ہمارے ساتھ تھا۔ ہم جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ اس نے میری جھونپڑی بنانے میں مدد کی۔ کمال گاڑی میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا' مگر وہ ضرور بچ نکلا ہوگا۔ بارہ برس کا ہے پر بڑا ہوشیار ہے' اپنے باپ کی طرح۔ اس کا باپ ...... سو' تمہاری حالت بالکل بگڑ چکی ہے' ایں؟"

تانگہ اب ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا جا رہا تھا' جھٹپٹے کا وقت تھا اور چاروں طرف پھیلا ہوا اپلوں کا دھواں آنکھوں کو لگ رہا تھا۔ علی نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا اور اندھیرے میں اسے پہچاننے کی کوشش کی۔

"میں سویا بھی نہیں۔" پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گیا۔ بانو اسے گرنے سے بچانے کے لئے دونوں بازوؤں میں بچے کی طرح سمیٹے بیٹھی رہی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ تازہ پھونس کی بنی ہوئی نیچی سی چھت والی جھونپڑی میں کھاٹ

پر پڑا تھا۔ جھونپڑی صاف ستھری اور تازہ لپی ہوئی تھی اور صبح کی نرم دھوپ دروازے کے راستے اندر آ رہی تھی۔ اس نے دماغ پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی' پھر کہنیوں کے بل اٹھا اور دوبارہ غش کھا گیا۔

دوسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ ڈھل رہی تھی اور بانو جھونپڑی میں کوئی کام کرتی ہوئی چل پھر رہی تھی۔ اسے ہوش میں پا کر وہ پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''اب تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے ابھی ابھی تمہیں دودھ پلایا ہے۔''

''دودھ؟''

''شکر ہے تمہاری جان بچ گئی۔ پہلے تین روز تک کوئی امید نہ تھی۔''

''کیا ہوا تھا؟'' بات کرنے کے لئے اسے جو طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی اس سے اسے اپنی نقاہت کا اندازہ ہوا۔

''بخار۔''

''کتنے روز؟''

''آج چھٹا دن ہے۔''

''اتنے دن تم؟''

''ہاں۔'' بانو ہنسی۔ ''پہلے تین روز کام پر نہیں گئی۔ اب کام پر بھی جاتی ہوں۔ نوردین بھی آتا ہے۔ صرف سٹیشن نہیں جا سکی۔ آج میں نے صفائی کی ہے' فرش لیپا ہے۔''

علی [illegible] ختم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی۔ پہلے چند روز وہ صرف اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا' پھر کھاٹ کو پکڑ کر کھڑا ہونے لگا۔ پھر اس نے دیواروں کا سہارا لے کر چلنا شروع کیا۔ بانو اس کا کھانا تیار کرکے کام پر جاتی' شام کو واپس آ کر پھر کھانا بناتی اور جھونپڑی کی صفائی کرتی اور اسے فرش پہ چیزیں بکھیرنے پر بچوں کی طرح جھڑکتی' پھر اسے لٹا کر زمین پر بیٹھ جاتی اور خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھی نوردین بھی آ جاتا تو وہ باتیں کرتے رہتے۔ بانو ہمیشہ زمین پر سوتی۔

جب وہ پہلی بار بغیر سہارے کے چل کر کوٹھری سے باہر نکلا تو خوشی سے بازو پھیلا کر اس نے ہوا میں لمبا سانس لیا۔ شام پڑ رہی تھی۔ جھونپڑی کی دیوار سے پشت لگا کر ساتھ ساتھ بیٹھے وہ اور بانو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب ہر طرف سناٹا بڑھ رہا تھا۔ آس پاس کی جھونپڑیوں میں کہیں کہیں دیئے جل رہے تھے۔ ان سے پرے ایک کتا لگاتار بھونک رہا تھا۔ یہ موسم خزاں کی شفاف اور خنک رات تھی۔ چاند کے گرد آسمان سبز رنگ کا تھا اور ہوا لحظہ بہ لحظہ لطیف تر ہوتی جا رہی تھی۔

''مجھے اپنی کہانی سناؤ۔'' علی نے کہا۔

بانو اٹھی اور اندر سے ایک موٹا کپڑا لے آئی جسے اس نے علی کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔ پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ رات کے سیاہ اور خاموش پرندے چاند کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یکساں' اداس آواز میں اس نے اپنی کہانی بیان کی:

''میری سیدھی سادی کہانی ہے۔ تمہیں کیا ملے گا۔ ناگپور کے پاس ایک گاؤں میں' جس کا نام کلیان پور تھا'

میں پیدا ہوئی۔ اس نام کا پنجاب میں ایک شہر بھی ہے۔ میرا نام شیلا تھا۔ ہم گاؤں کے اچھوت تھے۔ مذہب عیسائی۔ انگریز جو سب کے حاکم تھے وہ بھی عیسائی تھے' پتا نہیں ہم اچھوت کیوں تھے۔ یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن ہم ان کے نزدیک بھی نہ جا سکتے تھے۔ انگریزوں کے نہیں' گاؤں والوں کے چھوٹے بڑے سب کے نزدیک بس ہم جا ہی نہ سکتے تھے۔ اگر ہم غلطی سے کسی کے ساتھ چھو جاتے تو ہمیں اس کی سزا ملتی۔ لیکن سزا اسے بھی ملتی' یہ کہ جب تک وہ نہا دھو نہ لیتا گھر نہ جا سکتا اور جس کو چھو لیتا وہ بھرشٹ ہو جاتا۔ چنانچہ ہماری ناپاکی متعدی بیماری کی طرح تھی۔ مزا اس وقت آتا جب ہم سردیوں کی صبحوں کو لالو کے انتظار میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور وبے پاؤں نکل کر اسے چھو لیتے اور شور مچاتے ہوئے بھاگ جاتے۔ وہ گاؤں کا مسلمان دکاندار تھا اور نرا احمق تھا اور لنگڑا ہونے کی وجہ سے بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ اب سارے گاؤں کو پتا چل جاتا کہ لالو بھرشٹ ہو گیا۔ پھر کیا تھا جناب' اب کوئی ہندو گاہک اس کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ وہ ہمیں گالیاں دیتا ہوا ندی کی طرف چلا جاتا اور کانپتا ہوا واپس آتا۔ ہم دور کھڑے ہو کر دیکھتے اور خوشی سے تالیاں بجاتے۔ ہمیں پتا تھا کہ یہ بات مستقل مذاق بن چکی تھی چنانچہ ہمیں اس کی سزا نہ ملے گی۔ کبھی کبھی بھرشٹ ہو جانے پر لالو خاموشی سے ہاتھ باندھ کر گلی کے درمیان کھڑا ہو جاتا' خدا کے لئے شور نہ کرو' کتو۔ آج بڑی سردی ہے' میں مر جاؤں گا۔' وہ کہتا' پھر دکان کھول کر ہمیں تھوڑا تھوڑا گڑ دیتا۔ اب اچھے لوگوں کی طرح چپ چاپ چلے جاؤ کتے کے بچو شاباش۔' وہ کہتا۔ ہم خاموشی سے چلے آتے۔ اس طرح سے وہ ہماری اوپر کی آمدنی کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ ہم گلیوں کی صفائی کا کام کرتے تھے اور گاؤں والوں کی مشترکہ جائداد تھے۔ گھروں کے اندر ہم نہیں مویشیوں کے احاطے تک جاتے تھے۔ [illegible] جانوروں کو چھونے کی اجازت [illegible]۔ ہمارے برتن الگ تھے جن میں [illegible] اناج اور دوسری اجناس دی جاتیں اور ہمارا گھر گاؤں سے باہر جوہڑ کے کنارے تھا۔ آس پاس اور کوئی گھر نہ تھا۔ کھیتی باڑی کرنے کی ہمیں اجازت نہ تھی۔ جونہی ہم لوگ ہوش سنبھالتے گلیوں کی صفائی کے کام پر لگا دیے جاتے۔ میں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی کام پر لگ گئی۔ یہ بڑا عجیب واقعہ ہے۔

''میرا ایک بھائی تھا جو کام باپ کے ساتھ کام پر جایا کرتا تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی مگر میرا یہ بھائی بڑا عجیب تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی بات پر باپ کے ساتھ لڑتا رہتا تھا۔ شاید وہ کام چور تھا۔ ہر روز میرا باپ گھسیٹ کر اسے گھر سے نکالتا اور جھاڑو سے مارتا ہوا کام پر لے جاتا۔ لیکن وہ بڑا ذہین تھا۔ اسے سو تک کی گنتی فرفر یاد تھی جو میرے ماں باپ میں سے کسی کو نہ آتی تھی اور کھیتی باڑی ہمارا کام نہ تھا پر اسے ہر فصل کے بیجنے کاٹنے کے طریقے اور ان کے موسم یاد تھے اور صرف سات دن کی بوئی ہوئی فصل کو دور سے دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ کون سی فصل کا کھیت ہے اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں تھیں جن میں وہ گاؤں کے لڑکوں میں سب سے ہوشیار تھا۔ خیر ایک دن کیا ہوا کہ میرے باپ نے اسے خوب پیٹا اور وہ روتا روتا اور گالیاں دیتا ہوا سو گیا۔ رات کا جانے کیا وقت جب اس نے اٹھ کر مجھے کمر پر لادا اور باہر نکل آیا۔ میں بہت نیند میں تھی' جب میری آنکھ کھلی میں نے اپنے آپ کو اس کی پشت پر پایا۔ وہ جوہڑ کے کنارے کنارے چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ رات بڑی سنسان تھی اور جوہڑ کے پانی میں ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ پر رک کر اس نے مجھے اتار دیا۔

''اب میں نہاؤں گا۔' اس نے کہا اور کپڑے اتار کر پانی میں کود پڑا۔ دیر تک ڈبکیاں لگانے کے بعد وہ باہر نکل آیا اور ننگ دھڑنگ میرے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ 'اب میں پاک ہوں؟ بتا۔' میری بالکل نا سمجھی کی عمر تھی جو

میری سمجھ میں آیا میں نے کہہ دیا اور میں نے کہا: نہیں۔' وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دوبارہ خاموشی سے پانی میں اتر گیا اور خوب مٹی مل مل کر نہایا۔ پھر اس نے باہر نکل کر اپنا سوال دہرایا۔ 'اب پاک ہوں؟ بتا۔' مجھے پتا تھا وہ پاک نہیں ہے۔ میرے دوبارہ نہیں کہنے پر اس نے زور کا چانٹا میرے گال پر رسید کیا۔ پھر دوسرا' پھر تیسرا' پھر چوتھا یہاں تک کہ میرے کان سنسنانے لگے اور مجھے لگا جیسے اب میں عمر بھر کے لئے بہری ہو گئی ہوں۔ مگر اس وقت خوف کے مارے چیخ بھی میرے حلق سے نہ نکلی۔ اس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے نزدیک پہنچ کر اس نے بڑے آدمیوں کی طرح سینے پر ہاتھ باندھے اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''اب میں گنگا میں جا کر نہاؤں گا اور پڑھوں گا۔ مگر ایک نہ ایک دن میں ضرور واپس آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس رات اس نے جو کچھ کہا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں موجود ہے۔ اس رات بڑی سردی اور سناٹا تھا۔

''اب میں اس کی جگہ پر کام کرنے لگی۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے اور کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ صرف میری ماں ایک سال بیٹھے بیٹھے مر گئی۔ اب میں اور میرا باپ دونوں رہ گئے تھے اور میں سیانی ہو چکی تھی۔ ایک روز گاؤں کے زمیندار نے مجھے اپنے مہمان خانے میں بلایا اور باقی سب لوگوں کو باہر نکال دیا۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو کوئی گائے بھرشٹ ہو گئی ہے اور اب یہ مجھے جان سے مارنے والا ہے۔ لیکن اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا: بھولی بچی! عورتوں کے ساتھ سونے سے بھی کوئی بھرشٹ ہوتا ہے؟' میں اس وقت بارہ برس کی تھی۔ شام کو خوش خوش وہاں سے لوٹ آئی۔

''اب [illegible] رہنے لگی [illegible] بات تھی۔ اور وہ شخص برا آدمی نہ تھا۔ موٹے جسم کا تندرست بدھا تھا اور خوش مزاج تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مزدوری کیے بغیر مجھے اچھا کھانے اور پہننے کو مل جاتا تھا اور میں آرام میں تھی۔ صرف کبھی کبھی جب وہ میرے اوپر سوار ہو کر پاگلوں کی طرح کودنے لگتا تو مجھے خطرہ ہوتا کہ اب میں کچل کر مر جاؤں گی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ اس نے مجھے ایک اور شخص کے سپرد کر دیا۔ یہ شخص بھی زمیندار تھا اور عمر میں ذرا کم تھا مگر اسے بڑا گندہ پسینہ آتا تھا۔ بھئی کیا بدبودار شخص تھا۔ اس کے ساتھ لگنے سے میرا بدن بھی خراب ہو جاتا اور مجھے کئی کئی بار نہانا پڑتا۔ اس کے بعد جس آدمی کے پاس میں رہی وہ بڈھا اور بالکل نکما آدمی تھا اور کسی کام کے لائق نہ تھا۔ میں نے تیسرے ہی دن اس کی داڑھی نوچ ڈالی جس پر اس نے مجھے پکڑ کر خوب مارا۔ کافی دنوں تک ایسے ہی چلتا رہا۔

''اسی اثنا میں میرا باپ بڑھاپے سے مر گیا۔ اس کے چند روز بعد مدن کہیں سے آن وارد ہوا۔ یہ میرا بھائی تھا۔ اسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ ایک تو میں اکیلی تھی دوسرے گاؤں کے لوگوں سے بالکل اکتا چکی تھی اور پھر وہ میرا بھائی تھا۔ جب اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا تو میں خوشی خوشی اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئی۔ ایک روز شام کے وقت چپکے سے ہم نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اس وقت جب ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پرے جا رہے تھے اور پیچھے گاؤں کی دیواریں اندھیرے میں غائب ہوتی جا رہی تھیں تو ایک بار بھی میرے دل میں خیال نہ آیا کہ اب میں کبھی لوٹ کر یہاں نہ آؤں گی۔ کیسی عجیب بات ہے۔ اس گاؤں میں میں پیدا ہوئی تھی اور وہاں میرا گھر تھا۔

''راستے میں مدن نے بتایا کہ وہ چھ برس تک سکول میں پڑھتا رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی اس نے کئی کتابیں پڑھی تھیں جو سکولوں میں نہیں پڑھائی جاتیں اور یہ کہ اب وہ ایک بے حد اہم کام میں مصروف تھا اور اس کے